احساس

مائل خیرآبادی

خوب!

جب میرا دماغ درست ہوا تو کہتے ہیں خراب ہو گیا۔

میں پریشان تھا۔ میرے ذہن میں انتشار تھا۔ کچھ اچھا نہ لگتا۔ بے ارادہ اس مجلس میں چلا گیا۔ ایک مولانا صاحب وعظ فرما رہے تھے۔ مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ ان کی تقریر کا موضوع کیا تھا۔ جس وقت میں پہنچا، اس وقت مثال کے طور پر ایک واقعے پر روشنی ڈال رہے تھے۔ میں نے سنا۔

''جنگ بڑے زوروں پر تھی۔ گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ لشکرِ اسلام بڑھ بڑھ کر حملے کر رہا تھا۔ لیکن عیسائیوں کے بہادر سپاہی آہنی دیوار بن کر سامنے کھڑے تھے۔ ان کے جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ ایک طرف سے عورتیں انھیں جوش دلا رہی تھیں۔ دوسری طرف ان کے بچے بھی جھوم جھوم کر قومی ترانہ گا رہے تھے۔ وہ پکار پکار کر کہہ رہے تھے۔ اگر مسلمانوں نے میدان جیت لیا تو ہم سب لونڈی غلام بنا لئے جائیں گے۔''

''عیسائی بہادر عورتوں اور بچوں کی چیخ سنتے تو ان پر بے خودی چھا جاتی۔ وہ سب مرنے اور مارنے پر تُل گئے تھے۔ عالم یہ تھا کہ ایک شور برپا تھا۔ تلواروں کی جھنکاریں، نیزوں کی کڑک نعرۂ تکبیر اور نعرۂ تثلیث بلند ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی سر، پیر، ہاتھ کٹ کٹ کر گر رہے تھے۔ زخمیوں سے میدان پٹا جا رہا تھا۔ لیکن فتح وشکست

کے آثار دور تک نظر نہ آتے تھے۔ اچانک ایک آواز بلند ہوئی:

''مسلمانو! میں نے عیسائی سپہ سالار کو مار گرایا۔ یہ دیکھو اس کا گھوڑا، میں اس پر کھڑا ہوں۔ ساتھ ہی ایک طرف سے تیر آیا اور اس بہادر مسلمان کے حلقوم میں پیوست ہوگیا۔ وہ گھوڑے سے گرا، لیکن دوسرے مجاہد نے گھوڑے پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد وہ گھمسان کا رن پڑا کہ خدا کی پناہ۔ عیسائیوں کا سپہ سالار مارا جاچکا تھا۔ بے افسر فوج کتنی دیر لڑتی۔ آخر بھاگ کھڑی ہوئی۔ سامنے کی آہنی دیوار ٹوٹی۔ مسلمانوں نے کشتوں کے پشتے لگادیئے۔ اسی حالت میں کچھ عیسائی بچے ان کی تلواروں کی زد میں آگئے۔'' ''نعرۂ تکبیر'' میں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک شخص نے پکارا اور اس کے جواب میں ''اللہ اکبر'' کا شور بلند ہوا۔ اس شور میں مولانا صاحب کی آواز دب گئی۔ وہ خاموش ہوگئے۔ شور کم ہوا تو فرمایا:

''مسلمانو! تم نے پورا واقعہ نہیں سنا۔ اگر تم پوری بات سن لیتے تو درود پڑھتے۔ میرے اس واقعے کے بیان کرنے کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ جب اس جنگ کی رپورٹ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچی تو......۔''

مولانا صاحب ''تو'' کہہ کر رکے۔ پھر ایک سوال کردیا۔ ''مسلمانو! کیا خیال ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکرِ اسلام کو فتح کی مبارکباد دی ہوگی۔ شاباشی دی ہوگی؟''

''نہیں۔'' مولانا جذبات میں بھر گئے۔ انھوں نے فرمایا۔ ''نہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے معافی مانگنے لگے۔ ''پروردگار! میں نے عورتوں اور بچوں کو قتل

کرنے سے منع کیا تھا۔ اے اللہ! میں اس جرم سے بَری ہوں۔'' آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور آپؐ یہی الفاظ بار بار دہرا رہے تھے:

''مسلمانو! مجاہدین نے حضورؐ کی یہ کیفیت دیکھی تو اپنے کو لعنت ملامت کرنے لگے۔ کاش! ہم اس جنگ میں شریک نہ ہوئے ہوتے!''

حضرت ابوبکرؓ نہایت سنجیدہ بزرگ اور رازدارِ رسولؐ تھے۔ یہ منظر ان سے بھی نہ دیکھا گیا، وہ آگے بڑھے۔ عرض کیا: ''یارسول اللہ! مسلمان مجاہدین کو دیکھئے!''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکرِ اسلام کی طرف دیکھا۔ چشمِ مبارک سرخ تھی۔ فرمایا: ''مشرکین کے بچے تم سے اچھے ہیں۔''

مولانا کی زبان سے یہ سنا تو میرا دل دھڑکا۔ میرے منہ سے ''ہائے'' نکلی اور میں بیہوش ہو گیا۔ پھر جب میں ہوش میں آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اپنے گھر چارپائی پر لیٹا ہوں۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔ ''کوئی خطرے کی بات نہیں، اچانک دل پر اثر ہوا ہے۔''

ڈاکٹر یہ کہہ کر چلا گیا۔ میرے گھر والوں نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا ہوا تھا؟'' میں نے ''کچھ نہیں'' کہہ کر ٹال دیا، اٹھا اور ٹہلتا ہوا باہر نکل گیا۔

بلوے میں گجودھر میرے ساتھ رہتا تھا۔ ہم دونوں اس موقع پر قتل بھی کرتے، آگ بھی لگاتے اور لوٹ مار بھی۔ اس کے بعد آدھا آدھا بانٹ لیتے۔ میرے دل پر ایک بوجھ تھا جو میرے دل کو دبائے دے رہا تھا۔ میں سیدھا گجودھر کے گھر پہنچا۔ وہ ملا۔ میں نے کہا۔ ''یار! طبیعت بوجھل ہو رہی ہے۔''

''تو چلو!'' اس نے کہا اور ساتھ ہو لیا۔ بھٹّی پر پہنچا خود بھی چڑھایا۔ مجھے بھی

پلائی۔ میرا تجربہ تھا کہ شراب پینے کے بعد سارے غم دور ہو جاتے ہیں۔ خوف و ہراس مٹ جاتا ہے۔ لیکن وہ خیال جو مجلس میں ''ہائے'' کہتے وقت آیا تھا۔ اب مجھے اور میرے دل و دماغ کو توڑے دے رہا تھا۔ میں پریشان تھا۔ اچانک خیال آیا۔ اپنے کام پر جاتے وقت مزار شریف پر منّت مانتا تھا۔ پچھلے بلوے میں منّت مانی تھی کہ جو مال ہاتھ آئے گا، چوتھ مزار پر چڑھاؤں گا۔ شاید میں نے کم پیش کیا ہو۔ میں نے گھر جا کر ایک بڑا سا زیور لیا اونے پونے بیچا اور مزار پر چڑھا آیا۔

میرا دل، میرا دماغ اب بھی بے چین تھا۔ اب میرا جی چاہتا تھا کہ کہیں ڈوب مروں۔ ریل کے نیچے اپنے کو کٹوا دوں۔ یہ سوچ کر میں پھر بھٹّی پر گیا۔ خوب چڑھائی اور چلا ریل کی پٹری کی طرف۔ مگر خدا جانے کیسے...... آپ سے آپ کوتوالی چلا گیا۔ بڑے منشی سے کہا۔ رپورٹ لکھوانی ہے اور پانچ روپیہ کا نوٹ اس کے آگے رکھ دیا۔ اس نے قلم اٹھایا۔

''ہاں، کیا ہوا؟''

اس کے جواب میں میں نے کہا کہ پچھلے ہفتہ جو بلوہ ہوا تھا اس میں میں نے ہندوؤں کا ایک بچہ قتل کر دیا تھا۔''

بڑے منشی نے قلم رکھ دیا۔ مجھے دیکھا۔ میں پیئے ہوئے تھا۔ اس نے کہا۔ ''ٹھہرو!'' وہ انچارج تھانہ منوّر یار خاں کے پاس گیا۔ انھیں اپنے ساتھ لایا اور کہا: ''سنئے یہ کیا رپورٹ لکھاتا ہے۔''

منوّر یار خاں نے مجھے ایک موٹی سی گالی دے کر کہا۔ ''ابے دادا کے بچے

کیا ہے؟''

''حضور! رپورٹ لکھانے آیا ہوں۔ پچھلے ہفتے جو بلوہ ہوا تھا۔ اس میں میں نے ہندوؤں کا ایک بچہ قتل کر دیا تھا۔''

''سالے! تیرا دماغ خراب ہوا ہے کیا؟'' منوّر یار خاں نے پھر مجھے گالی دی۔ میری زبان سے آپ سے آپ نکل گیا۔ ''خوب! جب میرا دماغ درست ہوا ہے تو کہتے ہیں کہ خراب ہو گیا۔'' مجھے تاؤ آ گیا۔ میں نے کہا۔ ''دیکھئے حضور! بہت کھلایا ہے آپ کو۔ آپ رپورٹ لکھتے ہیں یا جاؤں مجسٹریٹ کے پاس۔''

میرے تیور دیکھ کر منوّر یار خاں ڈھیلا پڑ گیا۔ بڑے منشی سے کہا کہ اس کا بیان لکھ لو۔ اس کی دماغی جانچ کے لئے ڈاکٹری معائنہ کے الفاظ بھی شامل کر لینا۔ ڈاکٹری معائنہ کے بعد اسے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنا ہے۔ اس رپورٹ سے ہوتا کیا ہے۔ مستند بیان مجسٹریٹ کے سامنے دیا ہوا ہو گا۔

منوّر یار خاں بڑا گھاگ تھا۔ اس نے بات ٹھیک کہی تھی۔ رپورٹ لکھ لی گئی۔ پھر دو سپاہیوں کی حراست میں مجھے ڈاکٹری معائنہ کے لئے بھیج دیا گیا۔ ڈاکٹر نے مجھ سے بہت سوال کئے۔ میں نے بڑے ادب اور تہذیب کے ساتھ جوابات دیئے لیکن جب مجھ سے پوچھا گیا کہ بچے کو کس حالت میں قتل کیا۔ تو میں اپنے بس سے باہر ہو گیا۔ یہ مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں نے کہا۔ ''اس وقت بچہ ماں کا دودھ پی رہا تھا۔ میں نے چاقو نکالا۔ سوچا، بُندے سمیت کان کاٹ لوں۔ لیکن...... لیکن...... ڈاکٹر صاحب ...... ڈاکٹر صاحب......!'' میں پاگلوں کی طرح زمین پر پیر پٹکنے لگا۔ اِدھر اُدھر بھاگنے

لگا۔ کمپاؤنڈروں نے مجھے پکڑ لیا تو میں نے دیوار پر سر دے مارا اور بے ہوش ہو گیا۔

پھر جب میں مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوا تو پتہ چلا کہ ڈاکٹر نے مجھے پاگل لکھ دیا تھا اس کے الفاظ یہ تھے۔ ''اس کا (یعنی میرا) دماغی توازن نارمل نہیں ہے۔''

مجسٹریٹ کے سامنے میرا بیان ہوا۔ پھر مجھے جیل کے ہسپتال بھیجوا دیا گیا۔ وہاں سے مجھے آگرہ پہنچایا جانا تھا۔ مقامی اسپتال میں مجھے عبدالحکیم سیفیؔ ایڈیٹر اخبار ''سیف و قلم'' اور جگت نرائن کیفیؔ سمپادھک سماج سدھار ملے۔ نہ معلوم کیوں آئے تھے۔ ان دونوں نے بلوے کو روکنے کے لئے بڑے اچھے آرٹیکل لکھے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد پر اخبارات کے صفحے کے صفحے رنگ ڈالے تھے۔ لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کو کون سنتا ہے۔ اس وقت اخبار ''عقرب'' اور ''بچھو'' بڑے زوروں پر تھے۔ یہی اخبار گھر گھر جاتے تھے۔ سیفیؔ صاحب اور کیفیؔ جی کی کوششوں سے سیرت کمیٹی کی طرف سے وہ جلسہ ہوا تھا جس کی ایک مجلس میں میں بھی شریک ہوا تھا۔

سیفیؔ صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ ''دادا کیسے ہو۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ایڈیٹر صاحب! جب میرا دماغ درست ہوا تو انچارج تھانہ منوّر یار خاں اور ریاست نور خاں مجسٹریٹ مجھے پاگل قرار دیتے ہیں۔ پھر میں نے مولانا کا وعظ من و عن سنا دیا۔ اور کہا۔ ''عبدالحکیم صاحب، آپ بتائیے۔ میں کیا کروں۔ جب سے میں نے سنا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ ''مشرکین کے بچے تم سے (یعنی صحابہؓ) سے اچھے ہیں، میں بہت پریشان ہوں۔'''' عقرب کے ایڈیٹر صاحب تو کافروں اور مشرکوں کو سراپا نجس بتاتے رہے اور یہ کہتے رہے کہ انھیں اللہ کے گھر کے قریب نہ آنے دو۔''

سیفی صاحب اور کیفی صاحب دونوں میرے پاس بیٹھ گئے۔ جگت نرائن کیفی نے مجھ سے پوچھا۔ ''وفا خاں! یہ بتاؤ کہ تمہارے رسولؐ کی بات سچی ہوسکتی ہے یا ''عقرب'' کے ایڈیٹر کی؟''

''بات تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی ٹھیک ہوسکتی ہے۔''

''تو وفا خاں!'' کیفی جی نے کہا۔ ''تو چھوڑ دو وفا خاں ''عقرب'' کی باتوں کو، تم مسلمان ہو۔ تم کو تو اپنے نبیؐ کی بات دانت سے پکڑ لینا چاہئے۔''

میں نے عبدالحکیم سیفی کی طرف دیکھا۔ انھوں نے کہا۔ ''بھائی کیفی ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔''

''تو پھر ایک مشورہ چاہتا ہوں۔'' اسی وقت ڈاکٹر گشت کرتا ہوا آ گیا۔ سیفی صاحب نے اسے بٹھا لیا۔ میں کہہ رہا تھا کہ اب یہ بتاؤ کہ جب میں نے ایک معصوم بچہ قتل کر دیا اور پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سنی تو پھر اب میری بخشش کیسے ہوگی۔''

''ہوسکتی ہے۔'' کیفی جی یکدم بول اٹھے۔

''کیسے؟'' میں نے پوچھا۔ اب سیفی صاحب نے کہا کہ وفا خاں! توبہ کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے۔ تم توبہ کر کے سچے مسلمان بن جاؤ۔ اللہ بڑا غفور و رحیم ہے۔

میں نے سر جھکا لیا۔ مجھ پر جیسے غنودگی سی چھا گئی۔ سیفی صاحب اور کیفی جی ڈاکٹر سے باتیں کرتے رہے۔ تیسرے دن سیفی صاحب پھر اسپتال آئے۔ مجھے نہیں معلوم ہے کہ پرسوں سے اس وقت تک انھوں نے مجسٹریٹ اور کوتوال سے ملک کی کیا تدبیر کی۔ وہ آئے اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ مجھے اپنے دفتر میں رکھ

لیا۔ میں دفتر میں کام بھی کرتا تھا اور صبح کے وقت اخبار کا ہاکر بھی تھا۔ کیفی جی کو معلوم ہوا تو انھوں نے ''سماج سدھار'' کا بھی ہاکر بنالیا اور ایک فہرست دے دی کہ فلاں فلاں کے یہاں اخبار دے دیا کرنا۔

اب مجھ پر ایک حادثہ اور گذرا۔ کیفی جی نے جو فہرست دی تھی۔ اس میں پنڈت جے دیال کا بھی نام تھا۔ وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں کہیں باہر تعینات تھے۔ لیکن گھر اخبار ضرور جاتا تھا۔ میں اخبار دینے پنڈت جی کے گھر پہنچا تو مجھ پر اپنے پاپ کا تصور چھا گیا۔ اسی گھر میں گھس کر میں نے بچے کو قتل کیا تھا اور گجو دھر مال لوٹ کر لے گیا تھا۔ میں وہاں دم بخود کھڑا تھا۔ کسی نے مجھ سے کہا: ''کھڑے کیوں ہو، اخبار دے کر راستہ ناپو۔'' میں چونکا۔ میں نے کہا۔ ''اخبار لے لو۔'' اندر سے آواز آئی۔ ''بھیا پیسے لیتے جاؤ۔'' ایک بوڑھی مہلا دروازے پر آئیں۔ میں نے ان سے پوچھا:

''مائی! اس گھر میں اور کون رہتا ہے؟'' بولیں۔ ''بیٹا! میں ہوں اور میری بہو بس۔''

میں نے کہا۔ ''اماں! میرے پاس رسید نہیں ہے۔ میں آج نیا نیا نوکر ہوا ہوں پیسے پھر لے جاؤں گا۔'' وہ اخبار لے کر چلی گئیں۔ میں آٹھ بجے تک روتا اور اخبار بانٹتا رہا۔ پھر جب دفتر پہنچا تو سیفی صاحب بھانپ گئے۔ ''کیا ہے وفا خاں؟''

''برا حال ہے ایڈیٹر صاحب۔'' میں نے بتایا کہ پنڈت جے دیال جی کے گھر گیا تھا۔ وہاں جا کر میرا کلیجہ کٹ گیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ مائی جی کے چرنوں میں سر رکھ دوں اور کہوں کہ مجھے ذبح کر دیں۔ اسی طرح میرے دل کو تسلی ہو سکتی ہے۔''

''نہ نہ ہرگز نہیں۔'' عبدالحکیم سیفی صاحب نے تاکید کے ساتھ منع کر دیا۔ ''ہرگز

انھیں نہ بتانا کہ ان کے بچے کے قاتل تم ہو۔ جب اللہ نے تمہارا گناہ چھپا دیا تو تم کو کیا ضرورت ہے کہ کہتے پھرو۔''

''لیکن میں پنڈت جی کے گھر کی طرف جاؤں گا تو خود کشی کرنے کو جی چاہے گا۔''

''دیکھو وفا خاں! خود کشی اسلام میں حرام ہے۔ خود کشی کرنے والا ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں جلے گا، تم مسلمان ہو یہ کبھی نہ بھولو۔''

''تو پھر بتایئے میں کیا کروں؟''

''بتاؤں گا۔''

میں روز صبح اخبار بانٹنے جاتا رہا۔ ایک دن مائی جی نے کہا۔ ''بیٹا! بہورانی بیمار ہے۔ نسخہ میرے پاس ہے دوا لا دو۔ میں تم کو پیسے دوں گی۔''

میں جب ڈاکٹر ہریش کے مَطَب گیا تو اخبار بھی دیا اور نسخہ بھی پیش کر دیا اور پیسہ بھی۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک نظر مجھ پر ڈالی۔ نسخہ کو دیکھا۔ کچھ ادلا بدلا۔ میں نے دوائی لی اور مائی جی کو دے گیا۔ مائی جی مجھے ایک روپیہ دینے لگیں۔ میں نے کہا۔ ''اماں! میں یہ ہرگز نہیں لوں گا۔'' انھوں نے اصرار کیا لیکن میں بھاگ آیا۔

اس دن کے بعد جب اخبار دینے جاتا تو پھر خود پوچھتا۔ ''اماں کوئی سیوا؟ مائی جی بڑی غیرت دار تھیں۔ لیکن جب میں نے ہر دن اپنے کو سیوا کے لئے پیش کیا تو پھر دھیرے دھیرے وہ مجھ سے کام لینے لگیں۔ کبھی کبھی وہ مجھے کھانے کو بھی دے دیتیں۔ اب میں نے محسوس کیا جیسے میں خوش ہوں، میرے دل پر جو پتھر رکھا تھا وہ سرکنے لگا۔

عبدالحکیم صاحب اور جگت نرائن یہ سب دیکھ رہے تھے۔ دونوں بہت خوش

تھے۔ ایک دن دونوں نے نہ جانے آپس میں کیا کھسر پھسر کی۔ پھر مجھے دس روپیہ دیا اور کہا کہ سیب لے کر پنڈت جی کے گھر چلو۔ کہہ دینا کہ ہم دونوں آرہے ہیں۔

میں نے بڑے بڑے میٹھے سیب تین کلو لیئے۔ مائی جی کے پاس پہنچا۔ ان سے پیغام کہا۔ انھوں نے بیٹھک کھول دی۔ ''بیٹا! ذرا اسے صاف کردو۔ کرسیاں میز ٹھیک سے لگادو۔ اور او بہورانی! چولھے پر پانی رکھ دینا اور سنو تو گاڑی کا ٹائم بھی ہو گیا ہے۔''

میں نے جلدی جلدی بیٹھک صاف کی۔ میز کرسی قرینے سے لگا دی۔ دونوں ایڈیٹر آئے تو میں نے دیکھا کہ ایک تیسرے صاحب بھی آئے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ سب اسٹیشن ہو کر آئے تھے۔ تیسرے صاحب جو ساتھ تھے وہ تھے پنڈت جیدیال جی۔

مجھے یہ معلوم ہوا تو میں زمین میں گر گیا۔ دنیا بھر کے خیالات میرے ذہن میں آنے لگے۔ لیکن میری یہ تدبیر بہت اچھی رہی کہ میں دوڑ دوڑ کر کام کرتا رہا۔ اندر بھی باہر بھی۔ میں کبھی اندر سے پلیٹیں لاتا کبھی چائے وغیرہ۔ اس دن میں نے پہلے پہل بہورانی کو دیکھا تھا۔ کلی جیسا معصوم اور بھولا چہرہ مگر پھیکا پھیکا سا۔ ایک لمبی سانس کے ساتھ آہ سی میرے دل سے نکلی جسے میں دبا گیا۔ اسی کی گود تو میں نے سونی کی تھی۔

پنڈت جی سے دونوں ایڈیٹروں نے میرا تعارف کرایا۔ اور سفارش کی مجھے گھر کی دیکھ بھال کے لئے نوکر رکھ لیں۔ پنڈت جی بھی مدت سے ایک دیانت دار نوکر کی تلاش کر رہے تھے۔ ''وفا خاں!'' میرا نام سنا تو مسکرائے۔ ''اسم با مسمّٰی'' ان کی زبان سے نکلا اور پھر میں اُن کے گھر کا سیوک ہو گیا۔ یہ بہت اچھا ہوا۔ اس گھر میں سیوا کر کے میرا دل بہت خوش ہوتا تھا۔ مجھے جو تنخواہ ملتی تھی وہ میں مائی جی کے

پاس امانت کے طور پر رکھ دیتا۔ میں نے اپنے کو چوبیس گھنٹے کا نوکر سمجھ لیا تھا۔ میں کام کر کے تھکنے کا نام بھی نہ لیتا تھا۔ دونوں شریف مہلائیں مجھ سے خوش تھیں۔ کبھی کبھی مائی جی جن کو میں ماں کہتا تھا۔ مجھے آشیرواد بھی دیتی تھیں۔ اور بہورانی تو مجھے بھیا کہہ کر پکارنے لگی تھیں۔ اور پھر اس دن تو میں رو ہی پڑا۔ جب رکشا بندھن کے تیوہار کے موقع پر انھوں نے میری کلائی پر راکھی باندھی تھی۔ اور پنڈت جی مجھ سے مذاق کرنے لگے تھے۔ میرے جیجا جی ہو گئے تھے نا!

میرے دل کا بوجھ اتر گیا۔ ایک دن مجھے بجودھر ملا۔ اس نے کہا۔ ''سنا ہے کہ پنڈت جی کے گھر نوکر ہو گئے ہو۔ میرا نام تو نہیں لیا کبھی۔ دادا یاد رکھنا نام لیا تو اچھا نہ ہوگا۔''

وہ دھمکی دے کر چلا گیا۔ میرے دل میں کھوٹ نہ تھی۔ میں بے فکر تھا۔ ایک دن دو بجے رات کو کچھ کھٹکا ہوا۔ میں چونکا تو دیکھا کہ ایک شخص ڈھاٹا باندھے، چاقو تانے میری چارپائی کے سرہانے کھڑا ہے اور دو تین بہورانی کے کمرے میں ہیں۔ میں اُچک کر چارپائی کے دوسری طرف لڑھک گیا۔ ''مار ڈالوں گا سالے!'' میری زبان سے نکلا۔ میرے لڑھکتے ہی اس شخص نے چاقو چلا دیا۔ چاقو گدّے میں گھس گیا۔ کمرے سے مائی جی اور بہورانی کی چیخ بلند ہوئی۔ میں نے لپک کر چاقو والی کلائی پکڑ لی۔ وہ شخص چاقو چھوڑ اور جھٹکا دے کر بھاگ کھڑا ہوا۔ میں ہوشیار تھا۔ جاگ ہو گئی تھی۔ دو ڈاکو بہورانی کے کمرے سے نکلے اور نکلتے ہی مجھ پر چاقو سے وار کر دیا۔ مثل مشہور ہے ''لاکھ باندھ کر رکھو ہرن چھلانگ نہیں بھولتی۔'' میں نے پینترا بدلا۔ ایک کا چاقو خالی ہو گیا۔ دوسرے کا چاقو میری ران پر لگا۔ لیکن میں نے بھی اس کے پیٹ میں چاقو اتار دیا

تھا۔ وہ ہائے چیخ کر گرا۔ اس کا ساتھی بھاگ کھڑا ہوا۔ محلے ٹولے کے لوگ اکٹھا ہو گئے تھے۔ جس ڈاکو کو میں نے ڈھیر کر دیا تھا۔ اسے دیکھا بھالا گیا۔ وہ بجو دھر تھا۔ پھر پولیس آئی۔ بیان ہوئے۔ تھانہ عدالت کا بھی چکر مجھ سے لگوایا گیا۔ میری ران کا زخم اچھا ہو گیا۔ مجھے تو کچھ ہوا۔ ہوایا نہیں۔ سنا کہ بجو دھر جانبر نہ ہو سکا۔ مر گیا مردود۔

وہ دن ہے اور آج کا دن۔ مائی جی سورگباش ہو گئیں۔ بہورانی کی گود اللہ نے کئی بچوں سے بھر دی۔ میں اب ان بچوں کا سیوک ہوں۔ یہ بچے مجھے ماما جی (ماموں) کہتے ہیں۔ میں گھر کا سیوک نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ وفا خاں اس گھر کا مالک ہے۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اب گھر میں جب کوئی خوشی، تیوہار، یا رشتے ناتے کی بات ہوتی ہے تو بہورانی کہتی ہیں کہ ''میں کیا جانوں۔ بھیا جانے۔'' اور میں ہنس کر انتظام میں لگ جاتا ہوں۔ میں اب تمام روزے کا پابند ہو گیا تھا۔ روزوں میں بہورانی میرے لئے افطاری اور سحری کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیتیں۔ اور جب میں زیادہ کام کرتا تو ڈانٹتیں اور کبھی کبھی چپت بھی لگا دیتی تھیں۔ ''ارے بھیا! روزہ لگ جائے گا، کام چھوڑ، ذرا بیٹھ لگا لے۔'' اور پھر میرے شانے پکڑ کر میرے گدّے پر گرا دیتیں اور پھر کہتیں۔ ''سو! نہیں تو ڈنڈا لوں گی۔ ہائے کیسا پیار تھا اس ڈانٹ میں۔

آپ سمجھ سکتے ہیں میں بہت خوش ہوں۔ اسی سال رمضان میں میں نے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ وہ تشریف لائے مجھ سے فرمایا: ''وفادار خاں! ادھر آؤ۔'' میں آپ کی طرف چلا گیا۔ مگر میں ہکّا بکّا تھا۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ پیارے نبیؐ مجھے بلائیں گے۔ میں حضورؐ کے پاس چلا گیا۔ آپؐ

نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ فرمایا۔ ''تیرا گناہ اللہ نے معاف کر دیا اور دیکھ اُدھر۔'' حضورؐ نے جس طرف اشارہ فرمایا تھا۔ میں نے اس طرف دیکھا۔ ''جنت!'' میری زبان سے نکلا۔ جنت میں ایک بچے کو کھیلتے دیکھا۔ یہ وہی بچہ تھا جسے میں نے قتل کیا تھا۔ میں اسے لینے کے لئے بڑھا تو کسی نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''ابھی نہیں۔'' میں جاگ اٹھا۔ دیکھا بھورانی میرے سینے پر ہاتھ رکھے کہہ رہی تھیں۔ ''ابھی نہیں۔ یعنی ابھی سوتے رہو۔ عصر کے وقت میں خود جگا دوں گی۔'' میں نے کہا۔ ''دیدی! ایک بات پوچھوں۔'' پوچھ!'' ''آپ کا کوئی اور بچہ بھی تھا؟'' ہاں میرے بھیا! سات مہینے کا تھا۔ ہندو مسلم بلوے میں ایک پاپی نے اسے مار ڈالا تھا۔'' دیدی! اُسے ابھی میں نے خواب میں دیکھا تھا۔''

''کیسا تھا وہ؟'' ''بڑا پیارا شہزادہ لگ رہا تھا وہ۔'' ''کہاں تھا وہ؟'' جنت میں۔''

''ہٹ پگلے!'' ''سچ مچ دیدی!'' ''تو نے کیسے پہچانا؟'' ''آپ کی صورت سے بالکل مل رہا تھا۔'' ''تو پکڑ لاتا اُسے۔'' ''دیدی! میں بڑھا کہ اٹھا لوں۔ کسی نے مجھے روک دیا اور کہا کہ ابھی نہیں۔ جا گا تو دیکھا آپ میرے سینے پر ہاتھ رکھی ہیں اور کہہ رہی ہیں۔ ''ابھی نہیں۔''

بھورانی ہنسنے لگیں۔ مجھے ایسا لگا کہ ''جیسے سچ مچ اللہ تعالیٰ نے میرا گناہ معاف کر دیا۔ میں آج بھی اس خواب کو سچ سمجھ رہا ہوں۔''

☆☆☆

عبدالسلام کی رہائی

اُدھر پہاڑ کے دامن میں دھائیں کی آواز گونجی، اِدھر بازار میں "شیر، شیر" ہر ایک کی زبان پر تھا۔ دوکانیں دھڑا دھڑ بند ہونے لگیں۔ ٹھیک اسی وقت کئی سپاہی پرچہ بانٹتے ہوئے اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ وہ پکار پکار کر پرچے کا مضمون زبانی بھی کہہ رہے تھے۔ "شیروں کو کیپٹن عبدالجبار نے بھگا دیا۔ اب شیروں کا رخ شمال کی طرف ہے اور وہ یہاں سے بہت دور جا چکے ہیں۔"

کچھ دیر بعد کیپٹن عبدالجبار پہاڑ کے دامن سے نمودار ہوا۔ وہ بازار میں آیا۔ اس نے بھی سب کو یقین دلایا۔ اس نے شیروں کا فوٹو بھی لے لیا تھا۔ وہ ہاتھوں کو بلند کر کے شیروں کی تصویریں دکھا رہا تھا۔ شیر بڑے نہیں تھے۔ عبدالجبار نے بتایا کہ ان میں سے بڑا شیر دُم تک آٹھ فیٹ اور چھوٹا سات فیٹ سے زیادہ نہ تھا۔ اس نے اپنا یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ آدم خور نہیں تھے۔

سپاہیوں کی پکار اور کیپٹن عبدالجبار کی یقین دہانی نے بازار میں سکون پیدا کر دیا۔ عبدالجبار بازار سے سیدھا کرنل منشا کے خیمے میں گیا۔ وہ منتظر ہی تھا۔ عبدالجبار کے بیٹھتے ہی کرنل منشا نے اس سے کہا۔ "جبار! مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب فریدہ میں فوجی اسپرٹ کم ہوتی جا رہی ہے۔"

"مگر مجھے تو فریدہ میں بزدلی کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔"

"وہ علی سے کہہ رہی تھی۔" اے کاش! ہم جلد آزاد ہو جائیں اور اپنے دین پر

پوری طرح زندگی بسر کرنے لگیں۔"

"یہ تو ہم سب کی خواہش ہے۔"

میں نے فریدہ کے لفظوں کے معنیٰ یہ نکالے کہ وہ گھریلو زندگی بسر کرنے کے لئے بے قرار ہے۔ وہ علی پر طنز کر رہی تھی کہ جس قوم کے مرد نامرد ہو جائیں تو قوم کی عورتیں کب تک ثابت قدم رہ سکتی ہیں۔ جب کہ جہاد اُن پر فرض نہیں اور گوریلا جنگ میں پردے کی قید بھی اٹھ جاتی ہے۔

"لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ طنز علی پر نہیں بلکہ کابل کے ان بے غیرتوں پر ہے جنہوں نے غیّور پٹھان قوم کو روسیوں کے ہاتھ بیچ دیا۔ میں گواہ ہوں کہ فریدہ علی کی بہادری کو تسلیم کرتی ہے اور اس کے ساتھ اپنے کو محفوظ سمجھتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج آپ نے جس خطرناک مہم پر بھیجا ہے وہ ایسی نہیں کہ دوسرا شخص بخوشی قبول کر سکے۔"

"جبّار! وہ علی سے کہہ رہی تھی کہ کاش! وہ دن جلد آئے جب میں اپنے ہاتھ سے چولھے پر روٹی پکاؤں اور اپنے علی کو کھلاؤں۔"

یہ جذباتی فقرے سن کر سینئر کیپٹن عبدالجبار خاں جس کے متعلق مشہور تھا کہ اس پر جذبات کا اثر نہیں ہوتا چپ ہو گیا۔ اس نے کہنیاں میز پر ٹکا دیں۔ اور ہتھیلیوں پر سر رکھ لیا۔

☆

راوی کہتا ہے کہ جن دوشیروں کی تصویر کیپٹن عبدالجبار نے لی تھی وہ دونوں پناہ گزیں لوگوں اور مجاہدین کے کیمپوں سے ٹھیک ۳۶۷ کلومیٹر پر تیسرے دن دیکھے

گئے۔ اس کے بعد وہ ضرب تقسیم کے فارمولے سے مدد لے کر دو اور دو چار کی طرح بتاتا ہے کہ دو دن میں انھوں ۳۶۷ کلومیٹر کی مسافت طے کی۔ اگر ہم تیسرے دن تک یہ مان لیں کہ وہ پورے پچاس گھنٹے چلتے ہی رہے تو انھوں نے ۷۴ء۳ کلومیٹر فی گھنٹہ کے حساب سے سفر کیا۔ فی گھنٹہ ۷۴ء۳ کلومیٹر زیادہ تیز نہیں تو معمولی دوڑ سے ہی تسلیم کی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر ہم یہ بھی مان لیں کہ وہ دو دن میں ہر دن کم از کم آٹھ گھنٹے سوئے اور انھوں نے چلنے میں سولہ گھنٹے لگائے تو وہ ۳۴ گھنٹے چلے۔ ۳۴ گھنٹوں میں اتنی مسافت ۱۲ کلومیٹر فی گھنٹہ ہوئی۔ ۳۴ گھنٹے دونوں شیر مسلسل دوڑے ہوں تو ہم مان لیں گے۔ لیکن ۳۴ گھنٹے برابر دوڑتے رہنا ناممکن ہے۔

یہ حساب لگانے کے بعد اس نے دونوں شیروں کی جو کہانی لکھی ہے وہ حیرت انگیز بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ بہادری، حبّ الوطن اور اسلامی حمیت کا مظہر بھی ہے اور گوریلا تدبیر جنگ کا نمونہ بھی۔ وہ لکھتا ہے۔

ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ مجاہدین کیمپ کے دامنِ کوہ سے بھگا دیئے جانے والے شیروں کا جوڑا رات کو کس وقت ۳۶۷ کلومیٹر کے نشان پر پہنچا۔ وہ صبح کو ایک چٹان کے نیچے سوتا ہوا پایا گیا تھا۔ شیر اپنا کولہا شیرنی کی گود میں ڈالے مست پڑا سو رہا تھا۔ شیرنی اسے گرمی پہنچا رہی تھی۔ شیرنی جاگ چکی تھی۔ اور اپنی زبان سے شیر کی پشت چاٹ رہی تھی۔ شیر اسی حالت میں اس وقت تک پڑا سوتا رہا جب تقریباً دس بجے سورج کی کرنیں اس پر پڑیں۔ شاید وہ اب بھی نہ جاگتا لیکن شیرنی نے تھپّڑ مار کر اسے جگا دیا۔ شیر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ شیرنی نے اسے کچھ اشارہ کیا۔ وہ دبے پاؤں ٹیلوں اور

چٹانوں کی آڑ لیتا ہوا مین روڈ کے کنارے جا رکا۔ اور ایک طرف غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے کچھ دیکھا اور اچانک حملہ کرنے کے لئے مستعد ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ آگے پیچھے دو کاریں آ رہی تھیں۔ شیر جم کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے دونوں اگلے پاؤں کو ہاتھوں کی طرح بلند کیا اور پھر جب نیچے کیا تو دو دھماکے ہوئے۔ دونوں کاروں کا اگلا ٹائر پرخچے ہو کر اُڑ گیا تھا۔ کاریں لہرا کر لبِ سڑک گھاٹی کی طرف بے قابو ہو گئیں۔ پھر نہ جانے کیسے دونوں کھڑکیاں کھلیں۔ ان میں سے چھ فوجی کود کر باہر آئے۔ لیکن وہ کسی کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ بے قابو کار گھاٹی کے قریب پہنچی تو ایک شخص جو ہتھکڑی پہنے تھا اس نے اپنے کو کار سے نیچے گرا دیا۔ شیر نے جھپٹ کر اسے دبوچ لیا۔ قیدی کی چیخ نکل گئی۔ شیر نے اسے لا کر شیرنی کے سامنے ڈال دیا اور بولا۔ ''خبردار! چیں کی تو کچا چبا جاؤں گا۔'' اس وقت شیرنی نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ہتھکڑی کٹی اور قیدی اٹھ کر شیر سے لپٹ گیا۔ شیرنی غرّائی۔ ''جذبات کے تبادلے کا موقع نہیں ہے۔'' اور یہ کہہ کر جو چھلانگ لگائی تو ۶ افیٹ کی گھاٹی کود کر اگلی چٹان پر جا کھڑی ہوئی۔ پھر وہاں سے کودی تو شیر اور قیدی کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

اب شیر نے قیدی سے پوچھا۔ ''عبدالسلام! تمہاری چھلانگ کی لمٹ ۴ افیٹ ہے اور گھاٹی ۶ افیٹ ہے۔ میں تم کو منہ میں دبا کر تمہارے اور اپنے بوجھ کو سہار نہ سکوں گا۔'' اس نے پوستین کا ایک بٹن کھول کر دکھایا کہ میرے جسم پر ہتھیار لدے ہیں۔ ''اچھا ٹھہرو۔'' اس نے اپنے اگلے پیروں کی گدیاں کھولیں اور عبدالسلام کے پیروں میں باندھ دیں اور بتایا کہ ''دیکھو، جس طرح میں چھلانگ لگاؤں، اسی طرح تم بھی

چھلانگ لگا دینا۔ لیکن یہ خیال رکھنا کہ تمہارے اگلے پیر خالی ہیں۔ تمہارے پچھلے پیر جن میں گدیاں ہیں۔ یہ چٹان کے بیچ پڑیں اور پھر جم کر کھڑے ہو جانا۔"

شیر نے یہ کہہ کر چھلانگ لگائی۔ چٹان پر پہنچا، اِدھر اُدھر دیکھا۔ شیرنی دور ایک اونچی چٹان پر کھڑی تھی۔ وہ وہاں سے دہاڑی۔ شیر چھلانگیں لگاتا ہوا اس کی طرف چلا۔ عبدالسلام نے اس کی تدبیر پر عمل کیا۔ اور تھوڑی دیر میں شیرنی کے پاس پہنچ گیا۔ شیرنی نے شیر سے کہا کہ اب تم کو آدمی بن جانا چاہیئے اور عبدالسلام کی رہنمائی میں آگے بڑھنا چاہیئے۔ شیر ہنسا۔ شیر اور شیرنی نے پوسین اُتاری تو عبدالسلام دنگ رہ گیا۔ دونوں جدید آلات اور ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ عبدالسلام، علی کہہ کر شیر سے لپٹ گیا۔ پھر فریدہ کی خیریت پوچھی۔ فریدہ بولی:

"بھائی عبدالسلام! خیریت ہوتی تو میں گھر میں اپنے چولہے پر روٹیاں پکاتی۔ اللہ اللہ، گھریلو زندگی کتنی پُرسکون لگتی ہے۔"

عبدالسلام نے جواب میں کہا۔ "فریدہ! جب تک ہم جہاد کر رہے ہیں، تم کو گھر کی فکر نہیں ہونا چاہیئے۔ اچھا اب چلو۔"

فریدہ اور علی نے عبدالسلام کو بھی مسلح کیا۔ عبدالجبار نے تین کوہ شکن بم انھیں دیئے تھے۔ ان میں سے ایک عبدالسلام کو ملا تھا۔ اور اب آگے آگے عبدالسلام اور پیچھے پیچھے علی اور فریدہ دونوں چل دیئے۔ عبدالسلام انھیں پہاڑ کی بلندی پر لے گیا۔ دوربین نکالی۔ شمال کی طرف نشیب میں دیکھا۔ اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔

"اُف! میجر قدیر کی کمین گاہ روسیوں کے گھیرے میں ہے۔ کیسے پتہ لگالیا؟"

’’تم سے کچھ اگلوا سکے؟‘‘

’’مجھے قید کر کے پوچھا بہت مگر میں نے کہا کہ مجھے لے چلو۔ میں سب بتا دوں گا۔ میرے اس جھانسے میں آ گئے۔‘‘ جمال خاں نے روسیوں کو مبارکباد دی۔

اس کے بعد عبدالسلام نے پوچھا۔ ’’تم کو میری گرفتاری کی خبر کس نے دی؟‘‘

فریدہ نے بتایا کہ میں علی کے سوٹ کے لئے کپڑا خرید رہی تھی کہ وہ تمہارا شریر جمال خاں کا بھانجہ بارہ برس کا آغو آ گیا۔ اس نے کپڑا ہاتھ میں لیا اور بولا۔ ’’تو یہ کتان ہے چاند کی روشنی میں بکھر جائے گا۔‘‘ میں اچانک اس کی طرف مڑ گئی تو وہ مسجد میں چلا گیا۔ پیچھے پیچھے میں بھی گئی۔ وہاں اس نے بتایا کہ عبدالسلام گرفتار ہو گیا ہے۔ اگر تین دن کے اندر اسے آزاد نہ کرایا گیا تو قدیر بابا کی بھی خیر نہیں۔ اس کے بعد وہ تو بازار میں غائب ہو گیا۔ میں نے بابا سے کہا اور پھر بابا کے حکم سے ہمارے سینئر کیپٹن عبدالجبار خاں نے ہمیں لیس کر کے اس طرف بھیج دیا۔ راستے کا نقشہ اور نشان ہمیں زبانی بتایا گیا۔ الحمد للہ ہم کامیاب ہوئے۔ انشاءاللہ ہم قدیر بابا کو چھڑا لیں گے۔ اب دیر نہ کیجئے اور چلئے۔

عبدالسلام، علی اور فریدہ تینوں نہایت ہوشیاری کے ساتھ نشیب کی طرف اُترنے لگے۔ پھر ایک پہاڑی پر پہنچے۔ عبدالسلام نے دوربین آنکھوں سے لگائی تو فریدہ اور علی نے بھی دوربین کی مدد سے دیکھا۔ عبدالسلام نے بتایا کہ قدیر بابا بُرے پھنسے ہیں اور مدافعانہ جنگ لڑ رہے ہیں۔ ’’کیا خیال ہے علی! ہمارا کوہ شکن بم روسیوں کے اگلے دستے کو جہنم کی مبارکباد پہنچا دے گا؟‘‘

’’انشاءاللہ۔‘‘ اور تینوں نے بم ہاتھوں میں لے لئے۔ چھپتے چھپتے ایک چٹان

کی آڑ میں جم کر کھڑے ہو گئے۔ یہاں سے لڑائی کا رخ صاف پہچانا جاتا تھا۔ قدیر بابا کی کمین گاہ دھوئیں سے بھر گئی تھی۔ روسی فوج صاف نظر آ رہی تھی۔ عبدالسلام نے اللہ اکبر کہہ کر کوہ شکن بم اگلی صف پر مارا اور علی نے پچھلی صف پر۔ فریدہ نے اپنا بم محفوظ رکھا۔ دو بموں کے حملے سے روسیوں کی اگلی اور پچھلی صف کا صفایا ہو چکا تھا۔ اب تینوں نے رائفل سنبھالی اور تڑا تڑ کرتے ہوئے میجر قدیر کی کمین گاہ کی طرف چلے۔ میجر قدیر کے مجاہدین یہ غیبی امداد پا کر باہر نکل آئے۔ اور انھوں نے تینوں کی مدد سے باقی ماندہ فوج کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

عبدالسلام، فریدہ اور علی کو لے کر میجر قدیر کی طرف چلا۔ درّے پر مجاہد اسمٰعیل کی ڈیوٹی تھی۔ اس نے تین اجنبیوں کو دیکھا تو رائفل تان لی۔ عبدالسلام نے وقت برباد نہ کیا۔ بولا۔ ''تم نے دیکھا نہیں۔ چاند کی چاندنی کتان کو بکھیر دیتی ہے۔ مجاہد اسمٰعیل کی رائفل پھر اس کے داہنی طرف کھڑی ہو گئی۔ اس نے جوتوں کی ایڑیاں ملائیں۔ تڑاق کی آواز آئی۔ سلوٹ کیا اور راستہ دے دیا۔ تینوں قدیر بابا کے پاس پہنچے۔ میجر قدیر کو اطلاع مل چکی تھی۔ فریدہ دوڑ کر بابا سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔

''احمق لڑکی! یہ رونے کا موقع ہے یا خوشی کا؟ تم سب بروقت پہنچے۔ ورنہ آج مجاہدین کا خاتمہ تھا۔ لڑکی! میں اس وقت اللہ سے دعا کر رہا تھا کہ اے میرے رب! اگر یہ مٹھی بھر مجاہدین مارے گئے تو روئے زمین پر تیرے نام پر قربان ہو جانے والا ایک بھی نہ رہے گا۔ لڑکی آنسو پوچھ۔ یہی دعا ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر میں مانگی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اللہ اپنے فرشتوں کو بھیج کر ہماری مدد کرے گا۔

ایسا ہی ہوا۔ الحمدللہ......۔''

فریدہ کو قدیر بابا نے اپنے سے الگ کیا۔ پھر علی اور عبدالسلام کو گلے سے لگایا۔ بولا۔ ''عبدالسلام! ایک تیرے قید ہو جانے سے روسیوں نے ہمارا پتہ لگا لیا۔ اب ہم کمین گاہ بدل رہے ہیں۔''

اس کے بعد علی سے پوچھا۔ ''تمہاری واپسی کب تک ہے؟'' علی نے بتایا۔ ''میں آج ستاؤں گا۔ کل آپ سے ہدایت لوں گا اور سورج کی کرنیں تیز ہوتے ہی چل دوں گا۔''

''کیسے جاؤ گے؟''

''بابا! جیسے آیا ہوں۔ لیکن آپ سے ایک گذارش ہے۔ یہ فریدہ رابعہ بصری بنتی جا رہی ہے۔ کہتی ہے۔'' کاش! وہ دن جلد آتا جب ہم گھریلو زندگی بسر کرتے۔ کیمپ کی زندگی سے عاجز آ گئے ہیں۔''

قدیر بابا نے فریدہ کی طرف دیکھا۔ وہ جھنجھلا کر بولی۔ ''بابا! یہ علی اب مجھے بہت چھیڑنے لگا ہے۔ یہ خود بزدل ہوتا جا رہا ہے۔ بابا! اللہ کا سپاہی کہیں بزدل ہوتا ہے۔''

علی اور فریدہ کی دلچسپ جھڑپ سے بابا قدیر مسکرایا۔ اس نے صرف اتنا کہا کہ جب اسلام ہی نہ رہے گا تو کافرانہ گھریلو زندگی بسر کر کے ہم اپنے اللہ کو کیا منہ دکھائیں گے۔

فریدہ دانت پیس کر رہ گئی۔ علی سے بولی۔ ''اچھا تجھے واپسی میں بتاؤں گی۔'' علی نے پلٹ کر جواب دیا۔ ''بتاؤ گی کیا۔ جب شیرنی بن جاؤ گی تو میرا منہ ہی چاٹو گی اور اس کے بدلے سہانا سا تھپڑ لگا لو گی۔''

یہ دونوں اور لڑتے کہ کھانا آ گیا۔ سب نے مل کر کھانا کھایا۔ پھر علی فریدہ کا ہاتھ پکڑ کر آرام کرنے چلا گیا۔ ☆☆☆

شیر یا لومڑی

ایک تھا بادشاہ، وہ بہت اچھا بادشاہ تھا۔ رعایا کی دیکھ بھال خوب کرتا تھا۔ اس کے راج میں سب لوگ آرام سے تھے۔ وہ غریبوں کو خیر خیرات بہت کرتا رہتا تھا۔ اگر اس کو خبر ہوتی کہ اس کے راج میں کوئی ننگا بھوکا ہے تو اس وقت تک بادشاہ کو چین نہ آتا جب تک اس غریب کو کھلا اور پہنا نہ دیا جاتا۔

ایک دن بادشاہ شکار کو گیا۔ جنگل میں شکار کھیلتا رہا۔ دوپہر کے وقت ایک جگہ پڑاؤ ڈالا۔ بادشاہ وزیر اور لاؤ لشکر سب سستانے کو ٹھہر گئے۔ اچانک بادشاہ نے دیکھا۔ ایک بڑا سا گڈھا ہے۔ گڈھے میں ایک اَپاہج لومڑی پڑی ہے۔ اسے دیکھ کر بادشاہ نے دل میں سوچا۔ ''بے چاری اِس لومڑی کو کھانے کو کیسے اور کیا ملتا ہوگا؟''

بادشاہ یہ سوچ رہا تھا۔ اب اللہ میاں کی قدرت دیکھئے۔ اللہ میاں تو سب کو کھانا پہنچاتے ہیں نا۔ بادشاہ نے دیکھا کہ ایک شیر نے ایک ہرن کو دبوچا اور اس کا خون چوس لیا۔ پھر ہرن کو پنجے میں پکڑا۔ غصے میں زور سے جو پھینکا تو مردہ ہرن اسی گڈھے میں جا گرا۔ جس میں لومڑی پڑی ہوئی تھی۔ اب تو لومڑی نے خوب جی بھر کے ہرن کا گوشت کھایا اور کئی دن کھانے کو بھی اس کے پاس ہو گیا۔

بادشاہ یہ دیکھ کر مان گیا کہ سچ مچ اللہ میاں ہر ایک کو کھانا ضرور پہنچاتے ہیں۔

چاہے کوئی کیسا ہی اپاہج ہو اور کسی جگہ ہو۔ بس یہ خیال آنا تھا کہ اس نے وزیروں کو بلایا۔ کہا۔ "بہت دن بادشاہت کی، بہت دن اس بادشاہت کی کھکھیڑ میں پریشان رہا، ملا کیا؟ بس کھانا اور کپڑا۔ اب میں سمجھ گیا کہ اللہ میاں روزی ہر حال میں پہنچائیں گے۔ اس لئے کون رات دن محنت کرے، تم لوگ سب جاؤ۔ اب میں یہاں اکیلا رہوں گا اللہ میاں مجھے کہیں نہ کہیں سے روزی ضرور پہنچائیں گے۔"

یہ سن کر سارے وزیر بہت حیران اور پریشان ہوئے۔ ایسا اچھا بادشاہ، اگر اس نے بادشاہت چھوڑ دی تو پھر نہ جانے کون بادشاہ ہو۔ اچھا نہ ہو، بُرا ہو کہیں راج پاٹ سب چوپٹ نہ ہو جائے سارے وزیر یہی سوچنے لگے کہ بادشاہ کو کیسے سمجھائیں؟

وزیروں میں ایک بوڑھا وزیر بھی تھا۔ وہ بڑا قابل آدمی تھا۔ وہ آگے بڑھا، بادشاہ سے کہا۔ بے شک اللہ میاں سب کو روزی دیتے ہیں لیکن یہ بندے کی کوشش پر ہے۔ چاہے اپاہج لومڑی کی طرح دوسروں کے ٹکڑوں پر بسر کرے، چاہے شیر کی طرح روزی حاصل کرے اور دوسروں کو کھلائے۔ پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے زیادہ بہتر ہے۔" اے بادشاہ! پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیاری بات کا یہ مطلب ہے کہ جو کما کر دوسروں کو کھلائے، وہی بڑھ کر ہے۔ اب آپ بتائیں کہ آپ دوسروں کو کھلانا پسند کرتے ہیں؟

بوڑھے وزیر کی بات بادشاہ کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے کہا۔ "میں تو اپنی محنت سے کما کر دوسروں کو کھلانا زیادہ پسند کرتا ہوں۔" بادشاہ کی یہ بات سن کر سب خوش ہو گئے۔ اس کے بعد شکار کھیل کر شام کے وقت گھر کو لوٹ گئے اور بادشاہ راج پاٹ کرنے لگا۔

دادا کی بتّیسی

''تم سمجھتے ہو، تمہیں حلوہ چراتے کسی نے نہیں دیکھا؟''

میں نے کڑک دار اور بھیانک آواز سنی۔ اس کے بعد ہی ہنسی کا ٹھٹّھا سنائی دیا۔ میں نے مڑکر دیکھا۔ ڈر کے مارے میری جان ہی تو نکل گئی۔ میں چیخا۔ ''اُف اللہ۔'' دانتوں کی پوری بتّیسی تھی وہ اندھیری رات میں چاندی کی طرح چمک رہی تھی۔ بالکل ایسی جیسی جادوگروں کے پاس کھوپڑی ہوتی ہے۔ اس نے مجھے ڈرا ہوا اور سہما ہوا دیکھا تو ''ہاہاہا'' کر کے بولی:

''تم سمجھتے ہو، تمہیں حلوہ چراتے کسی نے نہیں دیکھا۔ میں نے دیکھا تھا۔ پہچانا مجھے؟ میں حلوے کے پاس ہی رکھی ہوئی کٹوری کے اندر تھی۔''

یہ کہہ کر بتّیسی پھر ''ہاہاہا'' کر کے ہنسی اور میری یہ حالت کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ میری گھگھی بندھ گئی۔ ''ہو، ہو، ہو'' اور میں چیخ پڑا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میں بُری طرح کانپ رہا تھا۔ امی جان میرے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں۔ ''کیا بُرا خواب دیکھا؟''

صبح

''امی جان! لایئے جلدی سے دودھ اور حلوہ دے دیجیے۔''

''جاؤ پہلے مسواک کرلو۔'' وہ بولا: ''کرلی امی جان!''

''کہاں کرلی۔ کب کی؟ بستر سے اٹھ کر سیدھے ادھر ہی تو آرہے ہو۔''

امی جان ڈانٹتی رہیں اور میں نے ہپ ہپ حلوہ ہڑپ کیا اور سڑپ سڑپ دودھ پی لیا۔ اب جو امی جان کو دیکھا تو ان کے تیوروں سے ڈرا۔ میں نے کہا:

''اچھا اچھا، امی جان! آپ ناراض نہ ہوں لیجئے میں مسواک کئے لیتا ہوں''

اب مسواک کرنے سے کیا فائدہ؟ رات بھر کی جمی ہوئی منہ اور دانتوں کی گندگی تو حلوے اور دودھ کے ساتھ پیٹ میں پہنچ گئی۔ میرا کیا۔ نہ کرو مسواک۔ دادا جان کی طرح تم بھی بھگتو گے۔ دانت گر جائیں گے۔ تب نقلی دانت لگائے پھرنا۔''

اُف اللہ! دادا جان کا پوپلا منہ مجھے یاد آ گیا اور پھر اُن کی وہ بتّیسی بھی یاد آ گئی، یہی بتّیسی تو تھی جو رات کو مجھے چبا جانے پر تُلی تھی۔ خدا نہ کرے مجھے بھی بتّیسی لگوانی پڑے۔

اس طرح دل ہی دل میں کہا اور پھر دل ہی دل میں پکّا ارادہ کرلیا کہ اب روزانہ مسواک کیا کروں گا۔ اب دیکھئے۔ ماں پڑوس میں گئی تھیں۔ دادا جان اپنے کمرے میں سو رہے تھے۔ میں صحن میں بیٹھا پھرکی نچا رہا تھا۔ اتنے میں کسی صاحب کے یہاں سے کسی خوشی میں مٹھائی آئی۔ میں نے مٹھائی لے لی۔ چپکے سے اپنے تکیے کے نیچے رکھ دی۔ گھر میں کسی کو نہیں بتایا۔ پھر رات آئی۔ رات آئی ہے تو نیند بھی آتی ہے نا! لیکن مجھے اس رات اس وقت تک نیند نہیں آئی جب تک چادر اوڑھے مٹھائی ختم نہ کرلی۔

خواب

نیند آتی ہے تو آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ بند آنکھوں سے جَنے کیسے خواب

دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بات ان تمام باتوں میں سے ایک بات ہے۔ جو ہی سمجھ میں نہیں آئیں۔ سویا تو مٹھائی کھا کر اور خواب دیکھا بُرا سا۔ خواب ہی نظر آتا تھا تو کوئی میٹھا سا خواب نظر آتا۔ خواب کیا تھا؟ وہی ڈراؤنا بتّیسی والا۔ اس پر طرّہ یہ کہ آج بتّیسی کے ساتھ ایک زنبور بھی تھا۔ بتّیسی نے اپنے دونوں جبڑوں کے درمیان زنبور کو پکڑ رکھا تھا۔ زنبور کی طرف اشارہ کر کے بولی:

''مٹّی! آج تیرے ان دانتوں کو اکھاڑتا ہے۔ ان میں مٹھائی کے ریزے بھرے ہیں۔''

''کیوں؟ اگر میرے دانت ٹوٹ گئے یا منھ میں چوٹ آ گئی تو۔'' آج میں نے جی کڑا کر کے کہہ دیا۔

''تم کو چوٹ کا تو بڑا ڈر ہے لیکن دانتوں میں بھرے ہوئے ریزوں کی پروا نہیں۔ جو صبح تک سڑتے رہیں گے اور سڑتے سڑتے زہر بن جائیں گے۔ بیوقوف لڑکے! تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔''

مٹّی زنبور لئے ہوئے میرے منھ کی طرف بڑھی۔ اب میں بہت پریشان ہوا میں نے کَس کے منھ بند کر لیا۔ گھبرا کر کہا:

''اچھا ٹھہرو! میں نے پکّا ارادہ کر لیا ہے کہ ہر روز مسواک کروں گا۔ میری امی سے پوچھ لو۔''

''ہی ہی ہی، ہاہاہا'' بتّیسی ہنسی پھر بولی:

''مٹّی! تو چور بھی ہے۔ جھوٹا بھی۔ بہانے باز بھی۔ تو ماں کا کہنا بھی نہیں مانتا۔

آج تیرے دانت تو اکھاڑنا ہی نہیں۔ ہاں، چل تو میرے زنبور!''

''ہوہو ہو'' میری گھگھی بندھ گئی۔ بُری شکل سے آواز نکلی۔ میں چیخ پڑا۔ آج میری چارپائی امی جان کے پاس ہی بچھی تھی۔ انھوں نے چیخ سنی۔ جگانے لگیں: ''مٹّنی مٹّنی! کیا خواب دیکھ رہے ہو، جاگو جاگو اور پھر مجھے ہلا ہلا کر جگا دیا۔

''اُف اللہ! کیسا بُرا خواب دیکھا۔''

''قُل اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاس'' پڑھو مٹّنی! ماں نے کہا اور میں کئی بار سورۂ ناس پڑھ کر اپنے اوپر دَم کیا۔ اب میں نے سوچا کہ سوؤں گا ہی نہیں تو خواب کیسے دکھائی دے گا۔ اور پھر بتّیسی کہاں سے پیچھا کرے گی۔ میں صبح تک جاگتا رہا۔

بتّیسی چرانا

میں دن بھر پریشان رہا۔ سوچتا رہا کہ یہ نقلی بتّیسی مجھے کیوں ڈراتی ہے؟ دن بھر یہی سوچتا رہا۔ شوکت، رؤف، کوکو، نغمی یا کسی اور دوست سے میں پوچھنا نہیں چاہتا تھا۔ کیسے پوچھتا ان سے۔ وہ سب میرا مذاق اڑاتے کہ مٹّنی ویسے تو بڑا رستم ہے لیکن ایک بے جان بتّیسی سے ڈرتا ہے۔

میں اپنے دوستوں سے نہ پوچھ سکا۔ سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔ سوچتے سوچتے یاد آیا کہ ایک دن ماسٹر صاحب نے کلاس میں بتایا تھا کہ سونے سے پہلے جو چیز دھیان میں رہ جاتی ہے، وہی گھوم پھر کر خواب میں دکھائی دیتی ہے۔

ہاں، یہ بات ہے۔ میں سمجھ گیا۔ دادا کی بتّیسی دن میں بار بار دیکھتا رہتا

ہوں۔ وہ میرے دھیان میں بسی رہتی ہے۔ اس لئے خواب میں اُس کو دیکھتا ہوں۔ اب یہ کروں۔ دادا کی بتّیسی ہی غائب کر دوں۔ نہ بانس رہے نہ بانسری بجے۔ بس بس، یہی ٹھیک ہے۔

میں نے دل میں ٹھان لیا کہ دادا کی بتّیسی کہیں پھینک دوں گا۔ میں دادا کے کمرے میں کئی بار گیا۔ دادا دن بھر بتّیسی منھ میں لگائے رکھتے ہیں۔ دوپہر کا کھانا کھا کر جب لیٹتے ہیں تو بتّیسی کٹوری میں رکھ دیتے ہیں۔ میں تاک میں رہا۔ دادا دوپہر کا کھانا کھا کر لیٹے۔ سو گئے جب دادا کے خرّاٹے بلند ہوئے تو میں چپکے سے اٹھا۔ دادا کے کمرے میں گیا۔ دھیرے دھیرے ننگے پاؤں کٹوری کے پاس پہنچا۔ میں نے بتّیسی اٹھالی۔ پھر ایک گملے میں گڈّھا کر کے بتّیسی اس میں دبا دی۔ اوپر سے اور مٹّی ڈال دی اور گھر سے نکل گیا۔

میں دن بھر اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا۔ میں سوچتا رہا کہ دادا اب جاگے ہوں گے۔ انھوں نے بتّیسی ڈھونڈی ہوگی۔ ابا جان، امی، اپیا، بھائی جان سب کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ دادا کی بتّیسی غائب ہے۔ سب ہی ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ گھر میں یہ باتیں بھی ہو رہی ہوں گی کہ منّی کہاں گیا؟ سب لوگ مجھ پر شک کر رہے ہوں گے۔ اگر میں دن بھر گھر نہ گیا تو سب کو یقین ہو جائے گا۔ ہو نہ ہو منّی ہی نے بتّیسی غائب کی ہے۔

یہ سوچ کر میں گھر آیا۔ یہاں سچ مچ سب مجھ سے پوچھنے لگے۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ مجھے نہیں معلوم۔ میں تو کھانا کھا کر گیا ہوں تو اب گھر میں آیا ہوں۔

اب تو سبھی پریشان ہو گئے۔ دادا بار بار پوچھ رہے تھے کہ بتّیسی ملی یا نہیں؟ ہر بار

ان کو جواب ملتا کہ نہیں ملی۔ وہ بے چارے سب سے زیادہ پریشان اور اداس تھے۔ مجھے کئی بار ان پر ترس آیا اور سوچا کہ سب کی آنکھ بچا کر گملے سے بتّیسی نکال لوں اور کٹوری میں رکھ دوں۔ لیکن تبھی چور وہ چور ہی کیا جو بتا دے۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ اگر کسی نے گملے سے بتّیسی نکالتے ہوئے دیکھ لیا تو بتا دے گا اور پھر پٹائی ہوگی۔

میں پھر گھر سے نکل گیا۔ رات کو اس وقت آیا جب سب لوگ کھانا کھانے بیٹھ چکے تھے۔ دادا کے لئے پتلی پتلی دَلیا پکائی گئی تھی۔ میں نے جب دادا کو دَلیا پیتے دیکھا تو میرا دل رو دیا۔ میں اٹھا کہ اب بتّیسی نکال کر دے دوں۔ لیکن پھر ڈر گیا۔ کھانا کھایا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ اب مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ مجھے بار بار دادا یاد آ رہے تھے۔ ان کی بتّیسی کی یاد میں سوتے میں بار بار چونک پڑتا تھا۔ مجھے لگتا، جیسے دادا پوچھ رہے ہوں کہ بتّیسی ملی یا نہیں۔ میں خواب میں گھر بھر کو پریشان دیکھتا تو پھر چونک پڑتا۔ میری نیند اڑ گئی۔ نو بجے، دس بجے، گیارہ بجے۔ بارہ میں نے نہیں سنے۔ میں بارہ بجے سے کچھ پہلے دوبارہ سویا تو میرے کانوں میں کھٹ پٹ کی آواز آئی۔ میں نے دیکھا کہ بتّیسی کھٹ پٹ کھٹ پٹ کرتی بڑے غصے میں میری طرف چلی آ رہی ہے۔

''اُف'' آ گئی کلا۔ میں نے دل میں کہا۔ پھر سوچا۔ روز روز کا جھگڑا ختم کیوں نہ کر دوں۔ اس کا مقابلہ کروں اور اسے توڑ کر رکھ دوں۔ یہ سوچ کر میری ہمت بندھی۔ میں اٹھا۔ ایک اینٹ اٹھا کر اس پر دھمک دی۔ بتّیسی ٹوٹ گئی اور اس کے دانت بکھر گئے۔

مگر مگر، یہ کیا؟ ارے یہ کیا؟ یہ کیا مصیبت آ گئی؟ دانت اچھل اچھل کر میرے منھ پر چاند ماری کرنے لگے۔ بتّیسی کا ہر دانت میرے ایک دانت پر تڑ سے پڑتا اور

میرے منہ کا دانت ٹوٹ کر گر جاتا۔ درد ہونے لگتا۔ دیکھتے دیکھتے سارے دانت ٹوٹ کر گر گئے۔ اور میں درد کے مارے ہائے ہائے کرنے لگا۔

میں نے دیکھا کہ بتّیسی کے دانت آپ سے آپ پھر جڑ گئے اور بتّیسی بولنے بھی لگی۔ اس نے ٹھٹھا لگایا۔ ''کیوں میاں منّی! تم نے میری بات نہ مانی۔ دادا کی بتّیسی چرا کر گملے میں دبا دیں۔ بوڑھی جان پر ترس نہ آیا۔ گھر بھر کیسا کیسا پریشان ہے۔ لیکن تم جیسی کپوت اولاد بھی نہیں دیکھی۔ پھر تمہاری یہ ڈھٹائی مجھ سے ٹکّر لی۔ اب دیکھی اپنی درگت۔ صبح پو پلے اٹھو گے تو پتہ چلے گا کہ دادا کو کیا دکھ ہے۔ سچ ہے جس کے نہ جائے بوائی وہ کیا جانے پیر پرائی۔

بتّیسی یہ کہہ کر غائب ہو گئی، میں درد کے مارے چیخ رہا تھا: ہائے امی، ہائے امی! ایک بار بہت ہی زور لگا کر امی کو پکارا تو مجھے ایسا لگا جیسے کوئی مجھے جگا رہا ہو۔ سچ مچ امی مجھے جگا رہی تھیں۔ میں کانپ رہا تھا، میرا ہاتھ میرے منہ پر تھا۔ ہائے امّی، ہائے امّی!

''ارے کیا ہے منّی بیٹے! خواب دیکھا ہے کیا۔ اٹھو اٹھو۔ آنکھیں کھولو۔'' امی نے جھنجھوڑ کر مجھے اٹھا دیا۔ میں بھونچکا۔ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ خواب میں میرے منہ سے خون نکل رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ خون نہ زمین پر ہے نہ میرے بستر پر اور اب میرے منہ میں دانت بھی ہیں اور درد بھی نہیں ہے۔

امی نے پوچھا۔ ''کیا خواب دیکھا بیٹا! کوئی بڑا بھیانک خواب ہے شاید۔'' میں نے اپنا سر امی کی گود میں رکھ دیا۔ وہ پیار کرنے لگیں۔ میں سارا حال کہہ سنایا۔ گملے سے بتّیسی نکال لایا۔ امی نے دھو کر کٹوری میں رکھ دی۔ میں نے امی سے کہا: ''کسی

سے کہئے گا نہیں۔''

امی نے وعدہ کیا کہ کسی سے نہیں کہا جائے گا۔لیکن اب ایسی حرکت نہ کرنا اور صبح و شام دونوں وقت دانت صاف کرلیا کرنا نہیں تو خواب میں بتّیسی تمہارا پیچھا نہ چھوڑے گی۔میں نے وعدہ کیا اور دل میں ٹھان لیا کہ اب دانت صاف رکھوں گا۔

☆☆☆

خوب ۲

عبدالسلام کی رہائی ۱۵

شیر یا لومڑی ۲۳

دادا کی بتّیسی ۲۵